(19) سب کہاں کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں

(مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ)
(۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء)

شاعر کا تعارف

نام مرزا اسد اللہ بیگ اور غالبؔ تخلص تھا۔ آغاز میں وہ "اسد" تخلص کرتے تھے۔ غالبؔ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ تھا۔ ان کے آباواجداد ایبک قوم کے ترک تھے جو سمر قند سے ہجرت کر کے برِصغیر پاک و ہند میں آباد ہو گئے۔ غالب ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد گرامی ایک جنگ میں مارے گئے۔ پھر غالبؔ کی پرورش کی ذمہ داری ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ پر آن پڑی۔ چار سال بعد چچا بھی وفات پا گئے اور یوں غالبؔ کی کفالت کی ذمہ داری ان کے نانا جان نے لے لی۔

غالبؔ جب تیرہ برس کے ہوئے تو ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے کر دی گئی۔ غالبؔ اپنے کثیر اخراجات کی بنا پر ہمیشہ تنگ دست اور مقروض رہے، ان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ تھا بلکہ چچا کی جو پنشن انھیں ملا کرتی تھی وہ بھی بوجوہ بند ہو گئی۔ البتہ غالبؔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی مقرر ہوئے تھے اور یوں اُن کی معاشی حالت کچھ حد تک بہتر ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد بدترین حالات کو غالبؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غالبؔ کی ذاتی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ دِلّی کی تاراجی، سیاسی و معاشرتی زبوں حالی نے غالبؔ کو بہت متاثر کیا، بالخصوص غالبؔ کی زندگی کا آخری حصہ بہت ہی زیادہ دکھوں اور تکلیفوں میں گزرا۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو غالبؔ کا دِلّی ہی میں انتقال ہوا۔

غالبؔ ہر دور کے اہم شاعر ہیں۔ اُن کی فنی عظمت کو ہر اِک نے سراہا ہے۔ غالبؔ اردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ غالبؔ کی ہمہ گیر شخصیت کی طرح اُن کی شاعری میں بڑا تنوع اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ غالب کے یہاں موضوعات کا اِک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں انفرادیت، جدّتِ ادا، پہلوداری، معنی آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات، نئے نئے الفاظ و تراکیب، طنز و ظرافت اور آفاقیت وغیرہ شامل ہیں۔

اہم تصانیف: دیوانِ غالب (اردو)، کلیاتِ غالب (فارسی)، عودِ ہندی (خطوط)، اُردوئے معلّٰی (خطوط)، پنج آہنگ (فارسی نثر)، مہرِ نیمروز (فارسی)، دستنبو (فارسی) وغیرہ

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

سب کہاں، کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

حلِ لغت

لالہ (ایک نہایت سرخ رنگ کے پھول کا نام جو گلاب سے بڑا ہوتا ہے) گُل (پھول، گلاب کا پھول) نمایاں ہونا (ظاہر ہونا) خاک (مٹی) پنہاں ہونا (چھپ جانا، پوشیدہ ہونا)

مفہوم

زمین میں جو حسین شخصیات دفن ہوئی ہیں، ان میں سے کچھ لالہ وگل کی شکل میں ظاہر ہوگئیں، جب کہ زیادہ تر ابھی چھپی ہوئی ہیں۔

تشریح

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالیؔ:

"غالبؔ عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں"

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتے ہیں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد کوئی بھی دوبارہ اس دنیا میں نہیں آتا۔

لیکن حسن کا جوشِ نمو اور شوقِ نمائش ایک ایسی چیز ہے جو حسن کو دوبارہ وجود میں لاتا ہے اور اہلِ عالم کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ چناں چہ شاعر کہتے ہیں کہ باغ میں لالہ اور دوسرے رنگ برنگے پھولوں کی خوب صورتی دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کیسی کیسی حسین صورتیں خاک میں چھپ گئیں اور کیسی کیسی عظیم شخصیات ہیں جو خاک میں دفن ہو گئیں۔ ان میں سے سب تو نہیں، البتہ کچھ حسین صورتیں پھولوں کی شکل میں زمین سے باہر آئی ہیں جب کہ ایک بڑی تعداد ابھی زمین میں پوشیدہ ہے۔ بقول شاعر:

ـہ ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا (ناسخ)

''کیا'' کا لفظ حیرت کے اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ کیسی حسین اور دل ربا صورتیں ہوں گی جو خاک میں مل کر مٹی ہو گئیں اور آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے چھپ گئیں۔ کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ خاک میں کیسے کیسے حسین اور دل نشین چہرے دفن ہو گئے۔ بڑے بڑے صاحبِ کمال، باصلاحیت، علم و فن میں یکتا اور پھول سے نازک اندام لوگ موت کی بے رحمی نے خاک میں ملا دیے۔ ان کا علم و ہنر، شان و شوکت اور حسن و جمال خاک میں دفن ہو گیا۔ لیکن ان میں سے کچھ صورتیں لالہ و گل کی شکل میں خاک کے پردے سے نکل آئی ہیں۔ دیکھنے والے ان میں گم گشتہ حسین چہروں کی جھلک پھر سے دیکھ سکتے ہیں۔ گویا دل نشین اور خوب صورت لوگ اپنے حسن و جمال کا جلوہ دکھانے کے لیے مٹی سے باہر آ گئے ہیں۔ بقول شاعر:

ـہ پھر تمھیں روز سنواریں، تمھیں بڑھتا دیکھیں کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو (وصی شاہ)

دراصل شاعر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زمین سے جو صورتیں باہر آئی ہیں وہ اتنی حسین ہیں تو زمین میں جو پوشیدہ ہیں وہ کیسی عظیم اور کتنی حسین شخصیات ہوں گی۔ خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے حسین لوگ خاک میں مل کر خاک ہوئے ہوں گے، جن میں سے چند ایک حسیناؤں کی صورتیں تو لالہ و گل کی شکل میں ظاہر ہو گئی ہیں مگر باقی حسینوں کا کیسے پتا چلے۔ بقول شاعر:

ـہ ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے (امیر مینائی)

شاعر نے حسن کے لازوال ہونے کو بیان کیا ہے۔ یعنی حسن کو فنا نہیں ہے یہ صرف شکلیں اور صورتیں بدلتا رہتا ہے۔ حسن فنا ہونے کے بعد بھی پھولوں کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔

اس شعر میں غالبؔ نے انسانی زندگی کی عارضی حیثیت کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی ظاہری زندگی میں کتنا ہی حسین اور طاقت ور کیوں نہ ہو، آخر کار اسے اسی مٹی میں مل جانا ہے جس سے وہ پیدا ہوا تھا۔ یہ کائنات ایک ایسا کارخانہ ہے جہاں کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا بلکہ ایک شکل سے دوسری شکل میں بدل جاتا ہے۔ آج جو صورتیں ہمیں باغ میں گل و لالہ کی شکل میں نظر آ رہی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک کہانی اور ایک وجود چھپا ہوا ہے۔ غالبؔ کا یہ اندازِ بیان ہمیں اپنی فانی حیثیت کو سمجھنے اور دنیا کی عارضی رونقوں سے زیادہ اپنی روح اور اعمال کی طرف توجہ دینے کا احساس دلاتا ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر انسان کو یاد دلاتا ہے کہ زندگی کی اصلیت کیا ہے اور کس طرح وقت کی گرد ہر خوب صورت چیز کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔

ـہ پھول سے چہروں کو مٹی میں ملا دیتی ہے موت ظالم ہے بہت حشر اُٹھا دیتی ہے

شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل کا نہایت عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔ حسنِ تعلیل سے مراد یہ ہے کہ شعر میں کسی امر کی ایسی علت (وجہ) بیان کی جائے جو حقیقت تو نہ ہو لیکن سننے میں اچھی لگے۔ شاعر محض تخیل سے کام لے کر کسی بھی واقعہ کی خوب صورت توجیہہ پیش کر دیتا ہے۔ یہاں بھی شاعر نے حسنِ تعلیل سے کام لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ لالہ و گل میں جو اس قدر حسن اور دل کشی ہے وہ ان حسین اور دل کش لوگوں کی وجہ سے ہے جن کو ان کی وفات کے بعد زمین میں دفن کر دیا گیا تھا۔ وہی حسین صورتیں اب ان خوب صورت پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ گویا پھول حسین لوگوں کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں۔ جتنا کوئی حسین ہوتا ہے اتنا ہی خوب صورت پھول اس کی مٹی سے نکلتا ہے۔ مصحفی کہتے ہیں:

ـہ آخر کو ہو کے لالہ اُگا نو بہار میں خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا (مصحفی)

فنی محاسن شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ شاعر نے صنعتِ حسنِ تعلیل کو نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ "نمایاں" اور "پنہاں" متضاد الفاظ ہیں جو صنعتِ تضاد ہے۔

شعر نمبر 2 یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

حل لغت رنگارنگ (طرح طرح کی، خوب صورت)، بزم آرائیاں (محفل سجانا) نقش ونگار (بیل بوٹے) طاقِ نسیاں ہونا (بھول جانا)

مفہوم ہمیں وہ خوب صورت محفلیں یاد تھیں جب ہم احباب کے ساتھ لطف اندوز ہوتے تھے لیکن اب وہ یادیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔

تشریح

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالیؔ:

"غالب عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں"

تشریح طلب شعر میں شاعر ماضی کے حسین لمحات یاد کرتے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں ایک وہ بھی وقت تھا جب ہم جوان تھے۔ وہ بے فکری اور لاابالی کا زمانہ تھا۔ سر پر ذمہ داریوں کا بوجھ بھی نہ تھا۔ ہم کسی دکھ درد سے آشنا نہ تھے۔ ہمارا مشغلہ دوست احباب کے ہمراہ عیش وطرب کی محفلیں برپا کرنا تھا۔ اس وقت زندگی بڑی حسین اور دل کش تھی۔ لیکن گردشِ زمانہ، نیرنگیٔ حالات اور عشق کے روگ نے ہم سے وہ سب کچھ چھین لیا۔ ایک مدت تک ہم ماضی کی ان حسین یادوں کو گاہے بگاہے تازہ کرتے رہتے تھے۔ ہمیں ماضی کا وہ زمانہ یاد آیا کرتا تھا۔ لیکن اب بڑھاپے اور ضعیفی میں ماضی کی وہ یادیں کھو چکی ہیں۔ اب ہم انھیں یاد بھی کرنا چاہیں تو وہ یاد نہیں آتیں۔ زندگی کی سب رنگینیاں ختم ہوگئی ہیں۔ بقول ناصر کاظمی:

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں ایک بھی خواب طرب یاد نہیں

کبھی ہر جلوۂ صد رنگ حاصل تھا نگاہوں کو اب اشکِ خوں بھی چشمِ شوق کو حاصل نہیں ہوتا (تابش دہلوی)

اس شعر میں شاعر نے دراصل تغیر زمانہ کے فلسفے کو بیان کیا ہے۔ دنیا میں کسی بھی چیز کو ثبات نہیں ہے۔ ہر چیز تغیر و تبدل کا شکار ہے۔ کوئی بھی شے ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ انسان کی زندگی، اس کے حالات، اس کی خوشیاں، اس کے رشتے ناتے اور تعلقات، الغرض کچھ بھی ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ وقت کی گردش کے سامنے انسان بے بس ہے۔ چناں چہ شاعر جب اربابِ شوق کی بزم آرائیوں کو دیکھتا ہے تو ایک حسرت سے کہتا ہے کہ کبھی ہم بھی نت نئی بزمِ عیش منعقد کیا کرتے تھے۔ ہم بھی بزم آرائیاں کرتے تھے۔ تب ہمیں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا سامنا نہیں تھا۔ لیکن اب وہ سب باتیں اور عیش کی محفلیں نہیں رہیں۔ وہ وقت نہیں رہا، وہ دوست احباب بچھڑ گئے، وہ محفلیں ویران ہوگئیں۔ ان کی یادیں دل میں مدتوں باقی رہیں لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ ان بزم آرائیوں کی یاد بھی ذہن میں باقی نہیں ہے۔ وہ بزم آرائیاں اب طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔ ایک اور جگہ غالب کہتے ہیں:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے (مرزا غالبؔ)

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں (مرزا غالبؔ)

"طاقِ نسیاں" اردو شاعری کی ایک بہت ہی خوب صورت ترکیب ہے۔ طاق کا مطلب ہوتا ہے دیوار میں بنا ہوا وہ خانہ جہاں چیزیں رکھی جاتی ہیں اور نسیاں کا تعلق نسیان یعنی بھولنے سے ہے۔ طاقِ نسیاں کا مطلب ہے بھلا دی گئی چیزوں کا خانہ یا فراموش کردہ یادوں کا گوشہ۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میرے ماضی کی وہ تمام خوشیاں اب میرے ذہن کے کسی ایسے گوشے میں جا پڑی ہیں جہاں سے ان کا واپس آنا ممکن نہیں، جہاں وہ اب گرد وغبار میں چھپ چکی ہیں۔

اس شعر کی خوب صورتی اس بات میں ہے کہ یہ انسان کی اس فطری کیفیت کو بیان کرتا ہے جہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے گردوپیش کے لوگ، دوست احباب اور رونقیں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ تنہائی میں ان پرانے لمحوں کو صرف یاد کرتا رہتا ہے۔ یہ صرف غالبؔ کا ذاتی دکھ نہیں بلکہ ہر اس انسان کا تجربہ ہے جو اپنی جوانی یا گزرے ہوئے خوش گوار وقت کو یاد کر کے ایک کسک محسوس کرتا ہے۔ شاعر اس شعر کے ذریعے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وقت کا پہیا کس طرح سب کچھ تبدیل کر دیتا ہے۔ جو کل تک آنکھوں کے سامنے تھے، جو زندگی کا حصہ تھے، وہ آج صرف نقش و نگار بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ ایک اداس مگر بہت پر اثر حقیقت ہے جسے غالبؔ نے سادہ اور عام فہم الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ یادیں باقی رہ جاتی ہیں مگر وقت اور وہ محفلیں پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتیں۔ شعر میں افسوس اور ملال کا جذبہ نمایاں ہے، وقت کی بے رحمی اور زندگی کی ناپائیداری کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مصرعِ اولیٰ میں لفظ ''بھی'' شعر کے مفہوم کو وسیع کر دیتا ہے۔

فنی محاسن شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ ''رنگا رنگ'' کے الفاظ ماضی کے حسین لمحات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مصرعِ ثانی میں ''طاقِ نسیاں'' نہایت بلیغ کنایہ ہے۔ شاعر نے ماضی اور حال کے تضاد کو خوب صورت علامات اور تراکیب سے بیان کیا ہے۔

شعر نمبر 3

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر — لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

حل لغت یعقوب (اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر)، یوسف (حضرت یعقوبؑ کے بیٹے اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر) خبر لینا (حال دریافت کرنا) روزن (روشن دان) دیوارِ زنداں (قید خانے کی دیوار)

مفہوم یعقوبؑ اپنے فرزند یوسفؑ کو زندان میں دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن مسلسل انتظار اور رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں زندان کے روشن دان بن گئیں۔

تشریح

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالیؔ:

''غالبؔ عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں''

تشریح طلب شعر تلمیح کا شعر ہے۔ شاعر نے یعقوب علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت عزیز تھے۔ لیکن ان کے سوتیلے بھائی ان سے حسد کرتے تھے۔ چناں چہ ان کے بھائیوں نے یوسفؑ کو ایک کنویں میں پھینک دیا اور گھر آ کر بتایا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کو ایک قافلے والوں نے کنویں سے نکال کر بازارِ مصر میں بطور غلام فروخت کر دیا۔ عزیزِ مصر نے یوسفؑ کو خرید لیا لیکن جب یوسفؑ جوان ہوئے تو عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا نے ان پر جھوٹا الزام لگا کر انھیں زندان میں ڈلوا دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی جدائی میں رو رو کر نابینا ہو گئے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''یوسفؑ کی جدائی کے غم میں ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں'' (سورہ یوسف: 84)

غالبؔ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب زندان میں قید تھے تو یعقوب علیہ السلام ان کی خبر گیری نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا حال نہیں پوچھ سکتے تھے لیکن ان کی آنکھیں دیوارِ زندان کے روشن دان بن گئیں اور ہر وقت یوسف علیہ السلام کا دیدار کرنے لگیں۔ شاعر نے یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کو روزنِ زنداں قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ آنکھیں نابینا ہونے کے بعد سفید ہو گئیں اور روشن دان کی طرح ہمہ وقت کھلی رہنے لگیں۔ جس طرح زندان کے روشن دان ہر وقت یوسفؑ پر کھلے رہتے تھے اور ان کو دیکھتے رہتے تھے۔ اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں نابینا ہونے کے بعد شب و روز یوسفؑ کو دیکھتی رہتی تھیں۔ ان آنکھوں

میں اب صرف یوسفؑ کی تصویر تھی اور وہ یوسفؑ کے سوا کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ بقول شاعر:

؎ اُلٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ عشق آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے

ایک جانب روزنِ دیوارِ زنداں ہونے سے مراد آنکھوں کا بے نور ہونا ہے اور دوسری جانب یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر یعقوبؑ کو یوسفؑ کی خبر نہ ہوئی مگر درحقیقت ان کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو کر ہر وقت یوسفؑ کا نظارہ کرتی تھیں۔ زنداں میں روزن قیدی کے لیے روشنی اور امید کا واحد ذریعہ ہوتا ہے لیکن وہ مکمل آزادی عطا نہیں کرتا۔ قیدی روزن سے باہر کی دنیا کو دیکھ سکتا ہے لیکن قید سے نکل نہیں پاتا۔ اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں نابینا ہونے کے باوجود یوسفؑ کے تصور کو دیکھنے کا ذریعہ بن گئیں۔ روزنِ زندان اور نابینا آنکھوں کی مشابہت نہایت خوب صورت ہے۔ جب آنکھیں بے نور ہو جائیں تو وہ سفید ہو جاتی ہیں اور روزن کی طرح ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں بھی نابینا ہونے کے بعد روشن دان کی طرح محسوس ہوتی تھیں جہاں سے وہ یوسفؑ کا دیدار کرتے رہتے تھے۔

دراصل غالب نے اس شعر میں نالہ وفریاد کی تاثیر اور اثر انگیزی کو بیان کیا ہے۔ محبوب کی جدائی میں آنسو بہانے کی تاثیر یہ ہوئی کہ محبوب ہمیشہ کے لیے اِن آنکھوں میں آبسا اور وہ جب چاہتے محبوب کا دیدار کر سکتے تھے۔ بقول شاعر:

؎ دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

شعر کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ غالبؔ نے تلمیح کے پردے میں عاشق کی کیفیت اور قیدی کی نفسیات کو بیان کیا ہے۔ جس طرح زندان کے قیدی کے لیے زندان کا روشن دان ہی واحد سہارا ہوتا ہے جس سے اسے امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ ایک سچے عاشق کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔ وہ بظاہر دنیا سے کٹ جاتا ہے گویا زنداں میں ہے لیکن اس کی آنکھیں محبوب کے راستے سے نہیں ہٹتیں۔ چاہے امید کی کوئی ٹھوس وجہ نہ بھی ہو، اس کی آنکھیں سراپا انتظار بن کر کھلی رہتی ہیں۔ عموماً آنکھیں تھک کر بند ہو جاتی ہیں یا انسان مایوس ہو کر منھ پھیر لیتا ہے لیکن غالبؔ کے مطابق "آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں" یعنی انتظار اس حد تک شدید اور مستقل تھا کہ آنکھوں نے جھپکنا اور بند ہونا ہی چھوڑ دیا۔ مسلسل ایک ہی سمت، ایک ہی راستے پر، دیکھتے رہنے، پلک نہ جھپکنے اور روتے رہنے سے آنکھیں بے نور ہو کر پتھرا گئیں اور روزنِ زنداں کی طرح کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ایک سچا عاشق شدت سے محبوب کا منتظر ہوتا ہے، وہ محبوب کی خبر نہ ملنے پر اس کے لوٹ آنے کی امید نہیں چھوڑتا۔ اس کا پورا وجود سراپا انتظار بن جاتا ہے۔

فنی محاسن شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ شاعر نے صنعتِ تلمیح کو نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ مصرع ثانی میں "روزنِ دیوار زندان" نہایت خوب صورت تشبیہ ہے۔

شعر نمبر 4 سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

حل لغت رقیب (مخالف شخص) ناخوش (ناراض) زنانِ مصر (مصر کی خواتین) زلیخا (عزیزِ مصر کی بیوی) محو ہونا (مشغول ہونا، مصروف ہونا) ماہِ کنعاں (کنعان کا چاند، مراد حضرت یوسفؑ)

مفہوم رقیبوں سے سب ناراض ہوتے ہیں لیکن مصر کی خواتین سے زلیخا خوش ہے کیوں کہ وہ بھی یوسفؑ کی گرویدہ ہو گئیں۔

تشریح

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالی:

"غالبؔ عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں"

تشریح طلب شعر تلمیح کا شعر ہے۔ شاعر نے حسن و عشق کی ایک روایتی داستان کو ایک بالکل نئے اور چونکا دینے والے انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ سب عاشق اگرچہ رقیبوں سے ناخوش ہوتے ہیں اور ہمیشہ ان سے حسد کرتے ہیں لیکن زلیخا مصر کی خواتین سے خوش ہے کہ وہ سب بھی کنعان کے چاند حضرت یوسفؑ پر دل و جان سے فدا ہو گئیں اور ان کو دیکھنے میں محو ہو گئیں۔

روایتی طور پر جب کوئی عاشق کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا بھی اس کے محبوب کی طرف دیکھے یا اس کا طلب گار ہو۔ اگر عاشق کو معلوم ہو جائے کہ کوئی دوسرا شخص بھی اس کے محبوب کا طلب گار ہے تو وہ اس سے حسد کرتا ہے۔ دنیا بھر کے عاشق اپنے رقیبوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ مصرع اولیٰ میں غالبؔ اسی عمومی رویے کو بیان کرتے ہیں کہ سب عاشق رقیبوں سے ناخوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایک تاریخی اور قرآنی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور عاشقوں کے اس عمومی قاعدے سے ہٹ کر ایک بالکل نئی اور انوکھی بات بیان کرتے ہیں۔

غالبؔ کہتے ہیں اگرچہ دنیا کا ہر عاشق اپنے رقیب سے نفرت کرتا ہے اور اس کا دشمن ہوتا ہے لیکن زلیخا ایک ایسی عاشق ہے کہ وہ اپنے رقیبوں (زنانِ مصر) سے ناراض نہیں تھی بلکہ وہ ان سے خوش تھی کہ وہ سب بھی اس کے محبوب کے دیدار میں محو ہو گئیں اور اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئیں۔

''زنانِ مصر'' سے مراد مصر کی وہ اشراف خواتین ہیں جو زلیخا کو طعنے دیتی تھیں کہ تم شاہی خاتون ہو کر ایک عبرانی غلام پر فریفتہ ہو گئی ہو۔ لیکن جب ان عورتوں نے خود حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو وہ ان کے حسن کی تاب نہ لا سکیں۔ ان کو دیکھنے میں اس قدر محو ہوئیں کہ پھل کاٹتے کاٹتے اپنے ہاتھ زخمی کر ڈالے۔

چناں چہ زلیخا اس بات پر خوش ہوئی کہ تم مجھے طعنے دیتی تھیں، اب خود تمھارا یہ حال ہے۔ اب دنیا کو معلوم ہو گیا کہ میرا عشق کسی معمولی انسان سے نہیں اور میرا محبوب کوئی عام انسان نہیں ہے بلکہ مجسم حسن ہے۔ رقیبوں کا بے خود ہو کر اپنے ہاتھ کاٹنا اور حضرت یوسفؑ کو دیکھنے میں محو ہونا، زلیخا کے انتخاب کی سچائی کی دلیل بن گیا اس لیے وہ رقیبوں سے ناراض ہونے کی بجائے خوش تھی۔ بقول شاعر:

ے وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے   اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو   (فیض احمد فیض)

ایک سچا عاشق محبوب کے حسن کی آفاقیت پر فخر محسوس کرتا ہے اور اس کی عالم گیر سحر انگیزی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زلیخا کو اس بات پر حسد نہیں ہوا کہ مصر کی دیگر عورتیں بھی یوسفؑ کو دیکھ کر فریفتہ ہو رہی ہیں۔ بلکہ اسے اس بات پر فخر ہوا کہ اس کا محبوب اتنا حسین ہے کہ جو بھی اسے دیکھتا ہے اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ بقول شاعر:

ے مرا ذوقِ نظر بھی داد کا طالب ہے اے جگرؔ   کہ جس پر مر مٹا میں، وہ جہاں کا انتخاب ہے   (جگرؔ مراد آبادی)

غالبؔ نے اس شعر میں بڑے فن کارانہ انداز میں بتایا ہے کہ دنیا کی تنقید اور ملامت کا کوئی ٹھوس وزن نہیں ہوتا۔ لوگ تب تک دوسروں پر آوازیں کستے ہیں جب تک وہ خود تجربے سے نہیں گزرتے۔ جیسے ہی وہ اس کیفیت یا تجربے کا حصہ بنتے ہیں، ان کا رویہ یکسر بدل جاتا ہے۔ اس شعر کا اصلاحی پہلو یہ ہے کہ کسی کی زندگی کے کسی پہلو پر رائے دینے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ کیا ہم خود اس صورت حال میں اس سے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ زلیخا کی یہ خوشی انتقامی نہیں بلکہ ایک ایسی تسکین ہے جو ثابت کرتی ہے کہ حسن کا جادو ایسا ہے کہ کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا، چاہے وہ کتنا ہی پارسا کیوں نہ ہو۔ غالبؔ کے کلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ عام انسانی جذبات کو بڑے فلسفیانہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں اور یہ شعر اسی کمال کی ایک عمدہ مثال ہے۔

''ماہِ کنعاں'' استعارہ ہے۔ جو حضرت یوسفؑ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا آبائی وطن کنعان تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں بے پناہ حسن و جمال عطا کیا تھا۔ اس لیے شاعر نے انھیں ''ماہِ کنعان'' یعنی کنعان کا چاند کہا ہے۔

مرزا غالبؔ کا یہ شعر ان کی منفرد طرزِ فکر، جدت پسندی اور روایت شکنی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ رقیب سے خوش ہونا اردو

غزل کی روایتی شاعری کے بالکل برعکس ہے۔ غالبؔ نے رقیب کے روایتی تصور کو اُلٹ کر رکھ دیا اور حسد ونفرت کی جگہ فخر اور تسکین کا جذبہ دکھایا ہے۔

فنی محاسن شعر فنی محاسن سے بھی بھرپور ہے۔ شعر میں ''ناخوش'' اور ''خوش'' کے الفاظ متضاد ہیں جو صنعتِ تضاد ہے۔ اسی طرح ''زنانِ مصر''، ''زلیخا'' اور ''ماہِ کنعاں'' کے الفاظ بطور تلمیح استعمال ہوئے ہیں۔ ''ماہِ کنعاں'' تلمیح کے ساتھ ساتھ استعارہ بھی ہے۔

شعر نمبر 5

بُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

حل لغت بُوئے خوں (خون کی ندی)، شامِ فراق (ہجر کی شام، تنہائی کی شام) شمعیں (شمع کی جمع، موم بتی) فروزاں ہونا (روشن ہونا)

مفہوم ہجر کی شام میری آنکھوں سے خون کی ندی بہنے دو، میں سمجھوں گا کہ میری آنکھوں میں دو شمعیں روشن ہو گئی ہیں۔

تشریح

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالیؔ:

''غالبؔ عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں''

تشریح طلب شعر میں شاعر نے نہایت اچھوتے انداز میں اپنے دردوغم کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ محبوب کی جدائی کی شام ہے۔ میری آنکھوں سے خون کے آنسو مسلسل بہنے دو، انھیں مت روکو۔ میں ان سرخ آنسوؤں کو یوں سمجھوں گا جیسے میرے سامنے دو شمعیں جل اُٹھی ہیں۔ غالبؔ اس شعر میں اپنی دردمندی اور عاشقانہ بے کسی کا ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو مبالغہ آرائی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب غم حد سے بڑھ جائے اور آنسو مسلسل بہتے رہیں تو ایک وقت آتا ہے کہ آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں اور پانی کے آنسو ختم ہو جاتے ہیں۔ غم کی شدت کے باعث خون کی گردش اور دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے جس کے سبب آنکھوں میں موجود باریک باریک رگیں پھٹ جاتی ہیں اور ان سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ جسے خون کے آنسو کہا جاتا ہے۔ میر تقی میرؔ اسی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

؎ اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

شاعر کی بھی ایسی ہی حالت ہے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے اتنے زیادہ آنسو بہہ رہے ہیں کہ وہ آنسو نہیں بلکہ آنسوؤں کی ندی بن گئے ہیں۔ فراق کی تکلیف اتنی شدید ہے کہ آنسوؤں کی جگہ اب خون بہنے لگا ہے۔ دل اتنا مجروح ہے کہ آنسو خون کی صورت میں بہنے لگے ہیں۔

مصرع ثانی میں غالبؔ نے خون کے آنسوؤں اور روشن شمعوں کے درمیان ایک خوب صورت تشبیہ قائم کی ہے۔ خون کے آنسو سرخ رنگ کے ہوتے ہیں، شمع جب جلتی ہے تو اس کی لو اور روشنی بھی سرخی مائل ہوتی ہے۔ ''شامِ فراق'' کے استعارے سے غالبؔ ایک تاریک، اداس اور غم کی فضا قائم کرتے ہیں۔ شام اندھیرے کی علامت ہے اور جب یہ اندھیرا جدائی کا ہو تو اس کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ محبوب کی جدائی میں زندگی بھی شام کی طرح ڈھل رہی ہے۔ ایسے میں غالبؔ کہتے ہیں مجھے جی بھر کر رونے دو۔ اندھیری رات میں چمکتے ہوئے سرخ آنسو ایسے محسوس ہوتے ہیں گویا اندھیرے کو مٹانے کے لیے دو شمعیں روشن کر دی گئی ہوں۔ یہ ایک حیرت انگیز تصویر کشی ہے۔ آنسو بہتے ہیں تو گالوں پر چمکتے ہیں، جیسے شمع کی لو روشن ہو۔ بقول شاعر:

؎ کبھی آہ لب پہ مچل گئی، کبھی اشک آنکھوں سے ڈھل گئے یہ تمھارے غم کے چراغ ہیں، کبھی بجھ گئے کبھی جل گئے

محبوب سے جدائی کی شام ایک عاشق کے لیے کڑی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن ایک سچا عاشق جدائی کے شدید ترین دکھ اور غم کو بھی تسلی کی خوب صورت شکل دے دیتا ہے۔ خون بہنے کا منظر تکلیف دہ اور ہولناک ہوتا ہے لیکن غالب نے اسے ''شمعیں فروزاں ہوگئیں'' کہہ کر خوب صورت منظر میں تبدیل کر دیا ہے۔ بقول شاعر:

جو آہ نکلی تو حور بن کر، جو نکلے آنسو تو بن کے گوہر
یہ کون بیٹھا ہے چھپ کے دل میں، یہ کون چشمِ پُر آب میں ہے

مزید یہ کہ شاعر مظلوم بن کر گریہ وزاری نہیں کر رہا بلکہ وہ اپنے رونے کو بھی فخر اور وقار سے بیان کر رہا ہے کہ دیکھو میری آنکھوں کے آنسو شامِ فراق کے اندھیروں کو روشن کر رہے ہیں۔ عموماً لوگ آنسو بہانے کو کمزوری سمجھتے ہیں مگر شاعر نے اسے ایک خوب صورتی میں بدل دیا ہے۔ اس کے یہ آنسو روشنی کا باعث بن رہے ہیں۔ بقول شاعر:

آنسو نہ ہوں تو عشق میں کچھ آبرو نہیں
ساری چمک دمک تو انھی موتیوں سے ہے

یہ غالب کا ایسا شعر ہے جس میں کوئی فریاد نہیں ہے۔ کوئی شکایت نہیں ہے۔ کوئی رحم کی درخواست نہیں ہے۔ شاعر یہ نہیں کہ رہا کہ دیکھو میں کتنا رو رہا ہوں۔ بلکہ وہ یہ کہ رہا ہے کہ دیکھو میں کس حوصلے سے سب کچھ سہہ رہا ہوں۔ راجا محمود آبادی نے کہا تھا:

''اگر غالب نے اپنی ساری عمر میں صرف یہ ایک شعر ہی لکھا ہوتا تو بھی اسے اردو کا سب سے بڑا شاعر بنا دیتا۔''

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور (مرزا غالب)

فنی محاسن شعر فنی محاسن سے بھر پور ہے۔ ''جوئے خوں'' مبالغہ ہے۔ ''شامِ فراق'' خوب صورت استعارہ ہے۔ جب کہ مصرع ثانی میں ''دو شمعیں فروزاں ہوگئیں'' ایک لطیف تشبیہ ہے۔ شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

شعر نمبر 6 رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

حل لغت رنج (غم، دکھ)، خوگر ہونا (عادی ہونا)

مفہوم اگر انسان غم سہنے کا عادی ہو جائے تو غم کا احساس مٹ جاتا ہے۔ مجھ پر اتنی مشکلات آئیں کہ اب کوئی مشکل، مشکل نہیں لگتی۔

تشریح

مرزا غالب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالی:

''غالب عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں''

تشریح طلب شعر میں شاعر نے انسانی نفسیات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر انسان کو بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت سی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسانی زندگی خوشی اور غم کا مجموعہ ہے۔ خوشیوں کے لمحات انسان کو مختصر معلوم ہوتے ہیں جب کہ غم کے لمحات طویل لگتے ہیں۔ انسان ہمیشہ خوشیوں کا آرزومند رہتا ہے لیکن خوشیاں اسے کم ہی ملتی ہیں۔ انسان پر جب پہلے پہل کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے یا اسے کوئی غم لاحق ہوتا ہے تو وہ بہت گھبراتا ہے۔ اگر انسان کو بار بار اور پے در پے غم ملتے رہیں تو وہ غموں کو سہنے کا عادی ہو جاتا ہے اور جب انسان کسی چیز کا عادی ہو جائے تو پھر اس کی طلب میں پہلی سی شدت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان غموں کو سہنے کا عادی ہو جائے تو اسے پھر کوئی غم غم نہیں لگتا۔ غموں کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ گویا انسان غم سہنے کا عادی ہوا تو غم مٹ گیا۔ غم مٹ جانے سے مراد یہ نہیں کہ خارج میں غم کے اسباب ختم ہو گئے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جذباتی اور باطنی طور پر انسان اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ اب وہ اس غم کو سہنے اور برداشت کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اسے غم کا سامنا کرتے ہوئے وہ پہلی سی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ جب انسان کسی کام کو مسلسل کرتا ہے تو وہ اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

۔ مسلسل غم سے، غم سہنے کی عادت ہو ہی جاتی ہے   یہ زحمت بھی تو رفتہ رفتہ رحمت ہو ہی جاتی ہے (محسن نقوی)

دوسرے مصرعے میں شاعر اپنی زندگی کی مثال دیتے ہیں کہ مجھ پر اتنی مشکلیں اور مصیبتیں آئیں کہ میں انھیں برداشت کرتے کرتے ان کا عادی ہو گیا ہوں اور اب مشکلات کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ یعنی میں خوگرِ آلام ہو گیا ہوں۔ اس لیے اب خوشی سے انھیں معمولی بات سمجھ کر برداشت کر لیتا ہوں۔ جب انسان دکھ کا عادی ہو جاتا ہے تو دکھ کا احساس جاتا رہتا ہے۔ ایک اور جگہ اسی مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں:

۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالبؔ)

اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ مسلسل جدوجہد اور صبر سے انسان کا دل اور حوصلہ اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ وہ تمام مشکلات اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ زندگی میں جب انسان پر یکے بعد دیگرے مصیبتیں آتی ہیں تو وہ ابتدا میں گھبراتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ ہر مشکل اسے آسان دکھائی دینے لگتی ہے۔

غالبؔ کی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے انھیں بچپن میں یتیمی، نوجوانی میں غربت، اولاد کی وفات، دلی شہر کی تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ الغرض ان کی تمام زندگی مسلسل دکھوں اور غموں کا سامنا کرتے گزری۔ بقول شاعر:

۔ زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے   جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں (ساغر صدیقی)

مسلسل مشکلات اور غم برداشت کرنے سے انسان کے اندر حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مشکل کو آسان بنانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا جائے اور اس کے سامنے ہمت نہ ہاری جائے۔ جب مصیبتیں سہنے کی عادت ہو جائے تو زندگی کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ یہ خیال اچھوتا اور نرالا ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ ندرت تصور میں نہیں آ سکتی۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ان کی ضد یعنی ان کے آسان ہو جانے پر کرنا درحقیقت حسنِ مبالغہ کی معراج ہے۔

فنی محاسن شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ شاعر نے سہلِ ممتنع میں زندگی کے فلسفے کو بیان کیا ہے۔ یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصرعِ ثانی میں "مشکلیں" اور "آساں" متضاد الفاظ ہیں جو صنعتِ تضاد ہے۔

شعر نمبر 7 یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں!   دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

حلِ لغت اہلِ جہاں (دنیا والے)، ویراں ہونا (سنسان ہونا، تباہ و برباد ہونا)

مفہوم اگر غالبؔ اسی طرح مسلسل روتا رہا تو کچھ ہی عرصہ بعد سب بستیاں اشکوں کے سیلاب سے تباہ ہو جائیں گی۔

تشریح

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بقول مولانا حالی:

"غالبؔ عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں"

مرزا غالبؔ کا یہ شعر ان کے درد بھرے کلام کا ایک بہترین نمونہ ہے جس میں انھوں نے اپنی ذات کے دکھ کو کائنات کے دکھ کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ غالبؔ اپنی شاعری میں اکثر اپنی تنہائی اور غم کو بیان کرتے ہیں لیکن اس شعر میں ان کا انداز کچھ منفرد اور فکر انگیز ہے۔ اس شعر میں وہ دنیا والوں سے مخاطب ہو کر اپنی کیفیت اور اس کے اثرات کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میں اسی طرح مسلسل روتا رہا، یعنی اگر میرے دل کا یہ درد اور میری آنکھوں کے یہ آنسو اسی شدت کے ساتھ بہتے رہے تو اے دنیا والو! تمھیں اس کا انجام یہ دیکھنے کو ملے گا کہ یہ آباد بستیاں ویران ہو جائیں گی۔

parho

اس شعر کے ظاہری مفہوم پر غور کریں تو غالبؔ اپنے رونے کو ایک بہت بڑی طاقت قرار دے رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا غم صرف ان کے اپنے وجود تک محدود نہیں بلکہ اس میں اتنی شدت ہے کہ اگر اسے روکا نہ گیا یا اس کا اظہار اسی طرح جاری رہا تو یہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ یہاں رونا محض آنکھوں سے آنسو بہانے کا نام نہیں بلکہ یہ دل کے ان گہرے زخموں کا اظہار ہے جو انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ جب انسان کا غم حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کے اردگرد کی خوشیاں بھی ماند پڑنے لگتی ہیں۔ غالبؔ اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ میرے غم کی تاثیر اتنی گہری ہے کہ اس کا اثر بستیوں پر پڑے بغیر نہیں رہے گا۔ غالبؔ کہتے ہیں:

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ   کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

ایک اور شاعر کہتے ہیں کہ:

رونے پر ہم جو آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں   شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

اس شعر میں شاعر ایک طرح سے اپنی اہمیت اور اپنے دکھ کی شدت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ وہ دنیا والوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ میری اداسی کو معمولی نہ سمجھو۔ اگر تم نے میرے اس درد کو نظر انداز کیا یا میں اسی حال میں رہا تو میرے آنسوؤں کا یہ سیلاب ان بستیوں کو بنجر اور ویران کر دے گا جہاں آج رونقیں ہیں۔ یہ شعر دراصل انسان کی اندرونی کیفیت اور بیرونی دنیا کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ دراصل جب ایک حساس انسان غمگین ہوتا ہے تو اس کی تاثیر پورے ماحول پر پڑتی ہے۔ اگر کوئی غمزدہ انسان مسلسل روتا رہے تو خوش گوار ماحول بھی اداسی سے بوجھل ہو جاتا ہے اور خوشیاں مٹ جاتی ہیں۔

غالبؔ کا یہ اندازِ بیان نہایت پر اثر ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ میں خود ویران ہو جاؤں گا بلکہ وہ بستیوں کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ایک شخص کی مایوسی اور اس کے آنسوؤں کا اثر پوری انسانیت یا معاشرے پر پڑ سکتا ہے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں محبت اور سکون تبھی قائم رہ سکتا ہے جب انسانوں کے دل خوش رہیں۔ اگر دلوں میں غم ہوگا تو یہ بستیاں جو بظاہر آباد اور پر رونق نظر آتی ہیں، خالی اور ویران ہو جائیں گی۔ یوں غالبؔ اس شعر کے ذریعے دنیا والوں کو یہ پیغام بھی دے رہے ہیں کہ انسان کے درد کو سمجھنا اور اسے بانٹنا کتنا ضروری ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے دکھوں کا مداوا نہیں کریں گے تو یہی غم ایک دن پوری دنیا کی رونقوں کو ختم کر دے گا اور ہر طرف ویرانی پھیل جائے گی۔ یہ شعر غالبؔ کے بلند تخیل اور ان کی انسانی ہمدردی کی ایک بہترین مثال ہے، جس میں وہ اپنے دکھ کو کائنات کے ساتھ جوڑ کر ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

مشقی سوالات

1 درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں:

(الف) لالہ و گل سے کیا مراد ہے؟

جواب: لالہ و گل سے مراد دنیا کا حسن و جمال ہے یعنی صاحبِ کمال، باصلاحیت اور حسین و جمیل لوگ ہیں۔

(ب) غالبؔ کن چیزوں کے بھول جانے کا افسوس کر رہا ہے؟

جواب: غالبؔ کو رنگا رنگ بزم آرائیوں کے بھول جانے کا افسوس ہے۔

(ج) جوئے خوں، شامِ فراق اور شمع میں کیا باہمی تعلق ہے؟

جواب: شمع جب جلتی ہے تو وہ پگھلتی (یعنی روتی) بھی ہے۔ شامِ فراق محبوب کی جدائی میں آنکھوں سے جوئے خوں بھی اسی طرح بہتی ہے۔

(د) رقابت کی روایت سے ہٹ کر زلیخا، زنانِ مصر سے کیوں خوش تھی؟

جواب: زلیخا زنانِ مصر سے اس لیے خوش تھی کہ اس کا محبوب اتنا حسین ہے کہ مصر کی دیگر عورتیں بھی اس پر فدا ہیں۔

(ہ) غالبؔ کے نزدیک رنج کو مٹانے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: غالب کے نزدیک جب رنج بہت زیادہ بڑھ جائے تو وہ مٹ جاتا ہے۔

۲ درج ذیل کثیر الانتخابی سوالات میں درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں:

(i) نکہتیں (ii) صورتیں (iii) مورتیں (iv) حیرتیں

(ب) طاقِ نسیاں کا نقش و نگار بنی ہیں رنگا رنگ:

(i) حسنِ آرائیاں (ii) جمالِ آرائیاں (iii) بزمِ آرائیاں (iv) خیالِ آرائیاں

(ج) قواعد کی رُو سے ''نقش و نگار'' ہے:

(i) مرکب عطفی (ii) مرکب توصیفی (iii) مرکب اضافی (iv) مرکب عددی

(د) غزل کا آخری شعر جس میں تخلص موجود ہو کہلاتا ہے:

(i) مطلع (ii) مقطع (iii) حسنِ مطلع (iv) مطلعِ ثانی

(ہ) ''جوئے خوں'' کا مطلب ہے:

(i) خون کا دریا (ii) خون کی ندی (iii) خون کا رنگ (iv) فشارِ خون

جوابات

الف	صورتیں	ب	بزمِ آرائیاں	ج	عطفی	د	مقطع	ہ	خون کی ندی

۳ اس غزل کے قافیوں اور ردیف کی نشان دہی کریں۔

جواب: قوافی: نمایاں، پنہاں، نسیاں، فروزاں، آساں، کنعاں، ویراں

ردیف: ہوگئیں

۴ درج ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کریں:

نقش و نگار ، طاقِ نسیاں ، دیوارِ زنداں ، جوئے خوں ، ماہِ کنعاں

جواب:

تراکیب	مفہوم
نقش و نگار	بیل بوٹے کا آرائشی کام
طاقِ نسیاں	بھول، فراموشی
دیوارِ زنداں	قید خانے کی دیوار
جوئے خوں	خون کی ندی
ماہِ کنعاں	کنعان کا چاند، مراد حضرت یوسفؑ

۵ مرزا غالبؔ کی بلند خیالی اور شاعرانہ اسلوب پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور بتائیں کہ خاص و عام میں ان کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟

جواب: اردو ادب میں مرزا غالبؔ کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ ایک فلسفی شاعر ہیں۔ مرزا غالبؔ ایک فلسفی ذہن رکھتے تھے۔ ان کی بلند خیالی اور نئی تراکیب نے اردو شاعری کو نیا رنگ دیا۔ ان کا شاعرانہ اسلوب سب سے الگ ہے۔ یہ مشکل الفاظ اور گہرے معنوں کا حسین امتزاج ہے۔ وہ روزمرہ جذبات کو بھی سائنسی اور منطقی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت کی خاص وجہ ان کا فلسفہ اور مشکل پسندی ہے، جو خواص کو پسند آتی ہے۔ عام لوگوں میں ان کی مقبولیت کا راز ان کا سہلِ ممتنع اور سچی انسانی نفسیات کی عکاسی

ہے۔ ان کے بہت سے اشعار اتنے سادہ ہیں کہ دیکھتے ہوئے معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر معانی کا ایک جہان آباد ہوتا ہے۔
نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی مرزا غالبؔ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے سادہ اور دل کش خطوط ان کی شہرت کی بڑی وجہ ہیں۔ بلاشبہ مرزا غالبؔ نے اپنی نظم و نثر سے ہر خاص و عام کو متاثر کیا۔

۶ غالب کی ایک اور غزل کا شعر ہے:

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

اس شعر کو فہم کے ساتھ پڑھیں اور بتائیں کہ زیرِ مطالعہ غزل کے مقطع اور اس شعر میں کیا کچھ مشترک ہے؟

جواب: درج بالا شعر اور غزل کے مقطع میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں اشعار میں غم کی شدت کو بیان کیا گیا ہے اور گریہ و آہ و زاری میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

صنعت حسنِ تعلیل: جب کلام میں کسی امر کی حقیقی وجہ اور علّت کو چھوڑ کر شاعر کوئی خیال یا شاعرانہ وجہ بیان کرے تو اس صنعت کو ''حسنِ تعلیل'' کہتے ہیں۔ مثلاً: غلام ہمدانی مصحفی کا شعر ہے:

آخر کو ہو کے لالہ اگا نو بہار میں
خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا

۷ زیرِ مطالعہ غزل کے مطلع کی تشریح صنعتِ حسنِ تعلیل کی روشنی میں کریں۔

جواب: دیکھیے تشریح اشعار

۸ زیرِ مطالعہ غزل کا پانچواں شعر زندگی کی حکمتوں اور صداقتوں کو سمیٹے ہوئے ہے، اس کی تشریح کریں اور غالبؔ کی ایک اور غزل کے اس شعر کو بھی شامل کریں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔